قائد اعظم اور نواب حمید اللہ خان آف بھوپال

این کوپلینڈ☆

موجودہ سیاسی رجحانات کے تناظر میں، شخصیت پرستی کا رجحان تیزی سے ختم ہو رہا ہے اور اس کی بجائے اداروں کے حوالے سے اقتصادی مسائل، سیاسی نظریات اور قومی شعور کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ اس طرح اصل توجہ اداروں کے کردار پر دی جاتی ہے، نہ کہ شخصیات کی سحر انگیزی پر۔ مگر خوشگوار حیرت کی بات یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے حوالے سے توجہ کا اصل مرکز قائد اعظم کا نام نامی اور ان کی ذات گرامی ہے، اداروں کا ذکر بعد میں آتا ہے۔

تسلیم، قائد اعظم کے کارہائے نمایاں کسی وضاحت کے محتاج نہیں۔ تاہم ہمارا خیال ہے کہ ان کی شخصیت کے حوالے سے جس قسم کی طلسماتی فضا پیدا کی جا رہی ہے، اس کا بھی کوئی منطقی جواز ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔ اس کیفیت میں معروضی حقائق کا عمل دخل کم اور ڈرامائی اتار چڑھاؤ کا عنصر زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ہم، حقائق اور واقعات کی بجائے شخصیات کے مطالعے اور ان کی مدح سرائی پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے واقعات کی بجائے سوانح عمری کی تفصیلات، ہماری توجہ کا مرکز بنتی ہیں۔ شخصیات کے سحر کا یہ عالم ہوتا ہے کہ مورخین بھی اپنی تحریروں میں شخصی کارناموں کو اجاگر کرنے کی روش اختیار کر لیتے ہیں۔ اور تاریخ کی کتابوں میں جہاں، جہاں افسانوی رنگ جھلکتا دکھائی دینے لگا ہے۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد، آیئے ہم قائد اعظم کی ذات کے حوالے سے بات کو آگے بڑھائیں۔ آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہو گی کہ متضاد نظریات کے حامل مورخین کے تجزیوں میں بھی بسا اوقات گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ سب سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ قائد اعظم کے سیاسی نظریات کو آپ ایک نظریاتی سفر نامے سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ مورخین کی رائے

☆Ian Copland, "The Quaid-i-Azam and the Nawab - Chancellor: Literary Paradigms in the Historical Construction of Indian Identity", *Comparative Studies of South Asia, Africa and the Middle East*,XVII:I (1997), pp. 52-62

(تلخیص: کرنل (ر) غلام سرور)

ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتی ہے، اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کے سیاسی سفر کے آغاز اوراس کے اختتام پر کافی فاصلہ پایا جاتا ہے۔ قائداعظم کے سوانح نگار، ان کے سیاسی سفر کے دو تین ادوار کو بہت اہم قرار دیتے ہیں۔ پہلا موڑ وہ تھا جب ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ قائد نے کانگریس سے الگ اپنی نئی راہ تلاش کر لی تھی۔ ان کی سوچ میں دوسری سب سے اہم تبدیلی ۱۹۲۹ء میں آئی جب انہیں اپنے پیش کردہ چودہ نکات کے بارے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ کلکتہ آل پارٹیز کنونشن کے فیصلے پر وہ اتنے کبیدہ خاطر ہوئے تھے کہ انہوں نے عملی سیاست سے رضاکارانہ طور پر کنارہ کش ہونے اور برطانیہ میں مقیم ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر ۱۹۳۲ء کا وہ دور جب قائد نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں کانگریس سے براہ راست نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان تینوں واقعات کی کڑیاں ملانے کی کوشش کی جائے، تو ہمیں مسلم لیگ اور تشکیل پاکستان کے مابین گہری مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ جیساکہ شروع میں عرض کیا ہے زیر نظر مقالہ میں قائداعظم اور تحریک پاکستان کے حوالے سے تمہیدی گفتگو کی گئی ہے۔ ہمارے مقالے کا اصل مقصد، قائداعظم کے ساتھ ساتھ مقابلتاً ایک گمنام شخصیت کا بھی تعارف کرانا ہے، جنہیں حمید اللہ خان والی بھوپال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جنہیں چیمبر آف پرنسز (Chamber of Prinses) کے دوبار چانسلر ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ قائداعظم اور حمید اللہ خان کے مابین کسی حد تک فکری ہم آہنگی پائی جاتی تھی اور ہم آگے چل کر دونوں کی فکری مماثلت کے بارے میں قدرے تفصیل سے بات کریں گے۔ سر دست ہم حمید اللہ کی سیاسی سوچ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں گے۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی سوچ میں قائداعظم کی سوچ کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ سوچ کی اس مماثلت کو آپ حسن اتفاق بھی کہہ سکتے ہیں۔

نواب حمید اللہ خان نے کھلے بندوں کبھی کانگریس سے الگ ہونے کا رسمی اعلان نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اپنے سیاسی سفر کا آغاز کانگریس میں شمولیت سے کیا تھا، مگر بعد میں اس کی قیادت سے مایوسی ہوئی تو انہوں نے اپنا وزن مسلم لیگ کے پلڑے میں ڈال دیا تھا۔

حمید اللہ خان، ستمبر ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت پر سب سے گہرا اثر، ان کی والدہ سلطانہ رضیہ بیگم کا تھا، جو اس وقت بھوپال کی حکمران تھیں۔ حمید اللہ کی ذہنی تربیت پر انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ موصوفہ خود اعلیٰ درجے کی تنظیمی صلاحیتوں سے متصف تھیں۔

ان کی تربیت کا دوسرا اہم نقطہ یہ تھا کہ بھوپال کے حکمرانوں کی ''پان اسلامزم''

(Pan Islamism) سے گہری وابستگی مسلم تھی۔ بھوپال نے ہمیشہ اسلامی قدروں کے تحفظ اور ان کے فروغ کے سلسلے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا تھا اور انیسویں صدی میں بھوپال کو اتنا اعزاز نصیب ہو گیا تھا کہ مسلمان ممالک کے دانشور، بڑی تعداد میں وہاں جاکر اپنے تحقیقی منصوبوں کو آگے بڑھانے میں مشغول ہو گئے تھے۔ عالم اسلام کے اتحاد کے سب سے بڑے داعی جمال الدین افغانی نے بھی کچھ عرصہ وہاں قیام کیا تھا۔ جہاں بیگم کے عہد حکمرانی میں ان اسلامی رابطوں نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ ترکی کی تحریک خلافت نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک ولولہ تازہ بیدار کر دیا تھا اور اسی بنا پر مذہبی تحریکوں نے بھی سیاسی روپ دھار لیا تھا۔ اور اس تحریک خلافت کے ضمن میں علی گڑھ کو ایک مرکزی مقام حاصل تھا۔ بھوپال تو بطور خاص، علی گڑھ کی محمدن پارٹی کے زیر اثر تھا۔ خلافت تحریک کے سرگرم اراکین میں ایم اے انصاری اور مولانا محمد علی کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ مولانا محمد علی حمید اللہ خان کے پرائیویٹ ٹیوٹر بھی رہ چکے تھے۔ جہاں بیگم کی روش سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ اتحادیوں کے جنگی منصوبوں کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھیں۔ ۱۹۱۹ء کے آس پاس انہوں نے انگریزوں کی متشددانہ کارروائیوں کی کھلم کھلا مخالفت بھی شروع کر دی تھی۔ انہوں نے جنرل ریگانالڈ ڈائر (Reginald Dyer) اور سر مائیکل اوڈائر (Sir Michael o' Duiyer) کے بپا کردہ ظلم و تشدد کے پیش نظر، پولیٹیکل ایجنٹ تک واضح طور پر یہ پیغام پہنچادیا تھا کہ ان دونوں کی پنشن ضبط کر دینی چاہیئے مگر ۱۹۲۲ء میں جب انہوں نے ہندوستانی عمائدین کی گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی تو ان کی اس مصالحانہ روش کے پیش نظر، ان کی تجاویز کو پولیٹیکل ایجنٹ نے شکست تسلیم کرنے کے مترادف قرار دینا شروع کر دیا۔

حمید اللہ کی شخصیت پر علی گڑھ بالخصوص مسلم یونیورسٹی کے گہرے اثرات تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد انہوں نے علی گڑھ میں قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ ڈگری لینے میں تو ناکام رہے مگر پانچ سالہ قانون کی تعلیم نے انہیں شعور کے زیور سے ضرور آراستہ کر دیا تھا۔ ساتھ ہی، حمید اللہ نے علی گڑھ کے ذہین طلباء سے اپنے تعلقات استوار کر لیے تھے اور آگے چل کر وہ انہیں بھوپال میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

انگریز حکمرانوں کے ساتھ البتہ ان کے مراسم چنداں خوشگوار نہ تھے۔ انگریز انہیں انتہا پسند گردانتے تھے اور انہوں نے حمید اللہ خان کو اقتدار سے محروم کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے

جانے نہ دیا تھا۔ ان کی والدہ جہان بیگم کی خواہش تھی کہ وہ ان کے جانشین کے طور پر تخت سنبھالیں، مگر انگریز اس تجویز کے حق میں نہ تھے۔ تاہم جہان بیگم نے کسی طور، سیکرٹری آف سٹیٹ کو آمادہ کر لیا تھا کہ دہلی کے وائسرائے، ان کے معاملات میں زیادہ مداخلت نہ کریں۔ حمید اللہ نے تخت سنبھال تو لیا مگر ان کی مشکلات میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ انگیریز حکمرانوں نے ان کی راہ میں آئے دن مشکلات کھڑی کرنا شروع کر دیں اور اس طرح ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ انگریز کے اس معاندانہ سلوک کو دیکھ کر لارڈ لینتھگو (Lard lintithqow) کو کہنا پڑا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ حمید اللہ کے ساتھ زیادہ بہتر انداز میں شریفانہ سلوک روا رکھا جاتا۔

انگریز کے اس معاندانہ سلوک کے رد عمل میں حمید اللہ نے اپنا سارا وزن، اس وقت کی معروف قومی تحریک "ینگ پارٹی" (Young Party) کے پلڑے میں ڈال دیا۔ اور ایم اے انصاری اور حکیم اجمل خان کی اپیل پر انہوں نے دہلی میں ایک تھیولاجیکل کالج (Theological College) کے قیام کے لیے چندے کی مہم کا آغاز کر دیا۔

۱۹۳۰ میں جب گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو حمید اللہ نے انگریز حکومت پر زور دیا کہ وہ معاملات کو مزید بگاڑ سے بچانے کے لیے احتیاط سے کام لیں۔ ان کے مشتعل جذبات کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے گاندھی جی کے بارے میں توہین آمیز کلمات استعمال کرنے پر لیڈی ولنگڈن کی سرعام سرزنش بھی کر دی تھی۔

مزید بر آں، انہوں نے شروع میں فرقہ پرستی اور مذہبی عصبیت کے حوالے سے کانگریس کے موقف کی حمایت کی تھی۔ محمد علی جناح کی طرح وہ بھی ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے ستمبر ۱۹۳۰ء میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں سرعام، ہندو مسلم اتحاد کے حق میں بھرپور دلائل دیے تھے۔ وہ اپنے نظریات میں کافی حد تک آزادانہ روش اور روشن خیالی کا مظاہرہ کرتے تھے مگر ان کے ناقدین کا کہنا ہے کہ اپنی ریاست بھوپال میں وہ اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار نہ تھے۔ بھوپال ریاست میں ہندو باشندوں کو بھی عام شہریوں جیسی آزادی حاصل تھی، مگر تعلیم اور ملازمتوں کے حصول کے ضمن میں ان پر متعدد پابندیاں عائد تھیں۔

تاہم ان فروعی تضادات کے علی الرغم آزادی کے حصول کے لیے حمید اللہ کے نظریات بڑے شفاف اور واضح تھے۔ اور وہ صحیح معنوں میں ایک محب وطن تھے۔ اور ان کی ہمدردیاں، مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس سے زیادہ وابستہ تھیں۔

محمد علی جناح نے تو کانگریس سے باضابطہ طور پر الگ ہونے اور اپنا راستہ خود منتخب کرنے کا اعلان کر دیا تھا، مگر حمید اللہ نے کبھی اس قسم کا کوئی عندیہ نہیں دیا۔ تاہم دھیرے دھیرے وہ بھی کانگریس کے نظریات سے بیزار ہوتے چلے گئے۔ اور بالآخر ان کی سوچ، کانگریس کی سوچ سے براہ راست متصادم ہو گئی۔ ۱۹۲۰ء میں وہ ''روشن خیال'' کانگریسی تھے۔ مگر بعد میں وہ مسلم قومیت کے حامی بن گئے یہ ذہنی اتار چڑھاؤ کیونکر رونما ہوا، اس کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے

حمید اللہ کی کانگریس سے دوری کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس تنظیم میں کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہو گئی تھی، جو ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ کانگریس کے چند سربر آوردہ رہنما، ۱۹۳۰ء کے اوائل میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ موتی لال ۱۹۳۱ میں آنجہانی ہو گئے۔ محمد علی ۱۹۳۱ء میں اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔ سید علی امام اور ڈاکٹر انصاری علی الترتیب ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء میں قوم کو داغ مفارقت دے گئے۔ ان زعما کی جگہ جواہر لال نہرو، سوبھاش بوس، راجندر پرشاد اور ولبھ بھائی پٹیل نے لے لی تھی۔ یہ سب قائدین، نواب بھوپال کے ہم عصر تو تھے، مگر ان کی سوچ میں کافی فاصلہ تھا۔ نہرو اور بوس، سوشلزم کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ اُدھر، پرشاد اور پٹیل سیاست کو خاص ہندو عصبیت کی عینک سے دیکھ رہے تھے۔ تاہم ایک بات ان قائدین میں مشترک تھی۔ وہ یہ کہ سب عمائدین انگریز کی حکومت سے نجات حاصل کرنے کے متمنی تھے۔ نواب حمید اللہ کا سارا سیاسی تناظر شخصی بادشاہت سے عبارت تھا اور ان کے لیے انگریزی سامراج سے ٹکر لینا چنداں آسان نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جمہوری مزاج سے اپنے آپ کو پوری طرح کبھی ہم آہنگ نہ کر سکے۔ جمہوریت ان کے نزدیک بدامنی، افراتفری، بددیانتی اور دکھ درد کا نام تھا۔ وہ اپنے اصولوں پر (جو غلط ہی سہی) سختی سے کاربند رہے۔ اور انہوں نے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق، اپنے قبلے کی سمت درست کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ مخالفت کی چنداں پروا نہ کرتے ہوئے، وہ اپنے موقف پر ثابت قدمی سے قائم رہے۔

آگے چل کر حمید اللہ، کانگریس کی روش سے کافی حد تک بیزار ہو گئے تھے اور انہوں نے یہ جان لیا تھا کہ اس جماعت کا مسلمانوں کے ساتھ سلوک چنداں قابل تحسین نہ تھا۔ کانگریس نے پے در پے ایسے فیصلے کئے تھے، جو مسلمانوں کے مفادات پر کاری ضرب لگا رہے تھے۔ حمید اللہ، کانگریس کے اس ''حسنِ سلوک'' کو برداشت نہ کر سکے اور یوں ان کے اس جماعت کے ساتھ اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔

یاد رہے کہ کانگریس سے کنارہ کش ہونے کے بعد بھی انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ۱۹۳۰ء میں گاہے، ان کی محمد علی جناح سے دہلی میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان ملاقاتوں کی نوعیت رسمی تھی، اور ان ملاقاتوں کے کوئی مثبت نتائج سامنے نہ آسکے۔ اس کے بر عکس انہوں نے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی سے اپنے مراسم بڑھانا شروع کر دیئے۔ یونینسٹ پارٹی سے تعارف کرانے میں میر مقبول احمد نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ میر مقبول احمد یونینسٹ پارٹی کے قائد سر سکندر حیات خان کے داماد اور یونینسٹ وزیر شوکت حیات کے چچا تھے۔ ۱۹۳۰ء کا سن اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ حمید اللہ کی سوچ پر مسلمان قومیت کی چھاپ مثبت ہوگئی۔ ان کی سوچ کو مزید جلا اس وقت ملی جب مئی ۱۹۴۱ء میں انہوں نے قاہرہ اور فلسطین کا دورہ کیا۔ اور اس کے نتیجے میں انہیں اسلامی دنیا (مسلم ورلڈ) کے تصور اور اس کے تقاضوں کا زیادہ بہتر شعور حاصل ہوگیا۔ نظام حیدر آباد دکن سے راہ و رسم بڑھانے کے بھی مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ اور حمید اللہ، اب مسلم قوم کے حوالے سے زیادہ کھل کر بات کرنے لگے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانوی راج کی گرفت جوں جوں کمزور ہونا شروع ہوئی اسی نسبت سے نوابوں اور مہاراجوں کے ایوانوں میں بھی بے چینی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ راجوں، مہاراجوں کے خلاف سبھا و مہا سبھا نے بھی نیا محاذ کھول لیا جو درباری نظام کے لیے ایک لمحہ فکریہ تھا۔

نواب بھوپال حمید اللہ خان اور قائداعظم کے مابین فکری ہم آہنگی کی داستان بڑی معلومات افزا ہے۔ محمد علی جناح، گوشہ تنہائی سے ابھر کر سامنے آئے تھے اور انہوں نے اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر مسلم لیگ کی قیادت سنبھال لی تھی اور صدر مسلم لیگ کی حیثیت سے انہوں نے مسلم لیگ کے منشور میں دوررس تبدیلیاں کی تھیں۔ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں مسلم لیگ کے منشور میں کافی حد تک لچک بھی آگئی تھی۔ انہوں نے انگریز حکومت سے محاذ آرائی کی بجائے مفاہمت کا راستہ اختیار کیا تھا اور لارڈ لنلتھگو اور سر سٹیفورڈ کرپس سے متعدد مسائل پر یقین دہانی حاصل کر لی تھی۔ اور اس طرح مسلمانوں کے نجات دہندہ کے طور پر انہوں نے اپنے منصوبوں کو آگے بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۸ء کے مابین، محمد علی جناح نے انتہائی کامیابی کے ساتھ، اپنے مقاصد کو آگے بڑھایا اور اپنی منزل کو جالیا۔ قائداعظم کی سوچ، پاکستان کی تشکیل پر منتج ہوئی۔ اُدھر حمید اللہ خان کا ''راجستھان'' کے تحفظ کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔

حمید اللہ کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ کسی طور، مسلم لیگ کے تعاون سے "نوابی نظام" کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ انہوں نے قائداعظم کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ کیبنٹ مشن کی تجاویز قبول کرلیں اور پاکستان کے مطالبے سے دست بردار ہو جائیں۔ حمید اللہ کی تجاویز کو کامیابی نصیب نہ ہو سکی اور اس طرح انہیں پے در پے نامرادیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

حمید اللہ خان نے ان ناکامیوں کے بعد بھی اپنا مشن جاری رکھا۔ اور وہ مسلم لیگ سے اخلاقی معاونت حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ انہیں انگریز حکمرانوں کی سرپرستی پر بھی بڑا بھروسہ تھا۔ انہیں یقین تھا کہ اگر تمام ریاستوں کے نواب اور مہاراجہ، مشترکہ موقف اختیار کرلیں، تو ان کے حقوق کو تحفظ مل سکتا تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے ایک تجویز یہ پیش کی کہ تمام ریاستیں مل کر ایک "کنفیڈریشن" کے قیام کی حمایت کریں جسے "راجستھان" کے نام سے پکارا جائے۔ ان کی یہ تجویز بھی نقش بر آب ہی ثابت ہوئی۔

حمید اللہ نے مسلم لیگ کو ہموا بنانے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کی مگر ۱۹۴۷ء تک ان پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ مسلم لیگ کی جانب سے انہیں اخلاقی امداد کے سوا، اور کچھ نہیں ملے گا۔ حمید اللہ، پے در پے ناکامیوں کے بعد بھی یہ تاثر دیتے رہے کہ وہ ریاستی نظام کے مفادات کو تحفظ فراہم کر سکیں گے، مگر اب ان کے کھوکھلے نعروں پر کسی کو یقین نہیں آرہا تھا۔

پاکستان کی تشکیل کے بعد انہوں نے پاکستان میں اپنے سیاسی کیریر کا آغاز کرنے کا ارادہ کیا۔ انہیں یقین تھا کہ قائداعظم سے دیرینہ مراسم کی بنا پر انہیں صوبائی گورنر کے عہدے پر تو ضرور فائز کردیا جائے گا۔ مگر اس ضمن میں بھی انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیاقت علی خان نے حمید اللہ کی سرعام مخالفت شروع کردی تھی۔ حمید اللہ کے بقول، لیاقت علی خان کو یہ خدشہ تھا کہ اگر انہیں (حمید اللہ کو) اقتدار مل گیا، تو لیاقت علی کی تقدیر کا ستارا گہنا جائے گا۔ حمید اللہ، ان ناکامیوں کے بعد، حسرت ویاس کی تصویر بنے، مشرق وسطیٰ میں جا مقیم ہوئے اور ۱۹۶۰ء میں وہ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ اس واقعہ کے تیس سال بعد ان کے پوتے، شہریار خان کو پاکستان میں سیکرٹری خارجہ کے عہدے پر فائز کردیا گیا۔ یہ منصب ایسا تھا کہ اگر اپنے وقت میں حمید اللہ کو سونپا جاتا تو وہ اسے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتے تھے۔

محمد علی جناح اور حمید اللہ، مسلم انڈیا کی دو اہم شخصیات تھیں۔ دونوں کی سوچ میں مماثلت کے کئی پہلو بھی ہیں اور اختلاف کے کئی زاویے بھی۔ دونوں نے قانون میں اعلیٰ تعلیم

حاصل کی تھی، دونوں شروع میں کانگریس سے وابستہ رہے تھے، دونوں، آگے چل کر مسلم قومیت کے علمبردار بن گئے تھے، دونوں کو اپنے سیاسی سفر کے دوران متعدد آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور دونوں، ان مشکلات پر قابو پانے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔ دونوں تدریجی انقلاب کے حامی تھے۔ خونی انقلاب، دونوں کی سوچ سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا تھا۔

مگر مماثلت کی داستان یہاں پر ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے ماحول کا بنیادی فرق یہ تھا کہ حمید اللہ، سونے کا چمچہ منہ میں لئے پیدا ہوئے تھے، جبکہ محمد علی جناح کو اپنا مقام حاصل کرنے میں کافی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ حمید اللہ کی نجی زندگی، خوشحالی اور سکون سے عبارت تھی جبکہ محمد علی جناح کی ذاتی زندگی، محرومیوں سے عبارت تھی۔ جناح نے سامراجی نظام کی ہمیشہ بڑھ چڑھ کر مخالفت کی تھی جبکہ حمید اللہ نے انگریزی حکومت سے کھلے بندوں کبھی بیزاری کا اظہار نہیں کیا تھا۔ محمد علی جناح کی کاوشیں، ان کی زندگی میں ہی بار آور ہوئیں اور انہیں پاکستان کے خواب کی عملی تفسیر دیکھنا نصیب ہو گیا تھا۔ اُدھر، حمید اللہ کا انجام حسرت و نامرادی سے عبارت تھا۔ قائداعظم، لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی آنکھ کا تارا تھے۔ مگر نواب حمید اللہ گمنامی کی موت مرے۔ تاریخ نے دونوں کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کر دیا تھا۔